Policy Research Journal
ISSN (E): 3006-7030 ISSN (P) : 3006-7022 Volume 3, Issue 9, 2025

منٹو کے 'آخری سلیوٹ' میں وجود، شناخت، اور بے معنویت: ایک وجودیاتی مطالعہ

(EXISTENCE, IDENTITY, AND MEANINGLESSNESS IN MANTO'S 'THE LAST SALUTE': AN ONTOLOGICAL STUDY)

ڈاکٹر اسد محمود خان

ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو منہاج یونیورسٹی، لاہور

assadphdir@gmail.com

DOI: https://doi.org/10.5281/zenodo.17067635

Keywords
Existentialism, Identity Crisis, Absurdity, War, Partition, Loyalty

Article History
Received: 11 June 2025
Accepted: 21 August 2025
Published: 06 September 2025

Copyright @Author

Corresponding Author: *
ڈاکٹر اسد محمود خان

Abstract:
This research paper offers an existentialist reading of Saadat Hasan Manto's short story "Aakhri Salute", analyzing the themes of identity, absurdity, and personal morality within the context of post-Partition conflict. Through the character of Subedar Rab Nawaz, the narrative explores the internal conflict of a soldier torn between duty to the nation and loyalty to personal relationships. Drawing upon the existential philosophies of Jean-Paul Sartre and Albert Camus, the paper highlights how Rab Nawaz's fragmented sense of self and moral ambiguity reflect the broader absurdity of war. The story questions nationalistic ideologies, as Rab Nawaz finds himself shooting at a former friend, Ram Singh, not out of hatred but due to imposed political divisions. This analysis emphasizes the existential crisis where individual values clash with collective ideologies, and where meaning is lost in the face of forced loyalties. Ultimately, Manto's story transcends political binaries, presenting war not as a heroic necessity but as a deeply human tragedy filled with ironic choices and absurd outcomes.

(ملخص)
یہ تحقیقی مقالہ سعادت حسن منٹو کے افسانے "آخری سلیوٹ" کا وجودیاتی تناظر میں مطالعہ پیش کرتا ہے، جہاں شناخت، بے معنویت، اور انفرادی اخلاقیات جیسے موضوعات کو تقسیم ہند کے بعد کے تناظر میں پرکھا گیا ہے۔ مرکزی کردار صوبیدار رب نواز کے ذریعے یہ کہانی ایک ایسے سپاہی کی داخلی کشمکش کو نمایاں کرتی ہے جو ریاستی فرض اور ذاتی تعلقات کے درمیان بٹ چکا ہے۔ ژاں پال سارتر اور البرٹ کامو کے وجودی فلسفے کی روشنی میں، رب نواز کی متزلزل شناخت اور اخلاقی ابہام کو جنگ کی وسیع تر بے معنویت کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ افسانہ قوم پرستی کے بیانیے پر سوال اٹھاتا ہے، جہاں رب نواز رام سنگھ پر گولی چلاتا ہے، مگر نفرت کی وجہ سے نہیں بلکہ سیاسی حد بندیوں کے باعث۔ یہ مطالعہ اس وجودی بحران کو اجاگر کرتا ہے جس میں فرد کی ذاتی قدریں اجتماعی نظریات سے ٹکراجاتی ہیں اور انسان اپنے اعمال کے معنی کھو بیٹھتا ہے۔ منٹو کا افسانہ جنگ کو ایک عظیم مقصد کے طور پر نہیں بلکہ ایک المیہ اور انسانی ناتوانی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

کلیدی الفاظ: وجودیاتی فکر، شناخت کا بحران، بے معنویت، جنگ، تقسیم، وفاداری

(1)

اردو افسانہ نہ صرف جمالیاتی اظہار کا ذریعہ ہے بلکہ یہ انسان کی داخلی کائنات، اس کے جذباتی انتشار، فکری الجھنوں اور وجودی سوالات کو بیان کرنے کا ایک گہرا اور فکری وسیلہ بھی ہے۔ افسانہ دیگر اصنافِ ادب، مثلاً ناول، نظم یا ڈرامہ کے مقابلے میں محدود ساخت کا حامل ہوتا ہے، مگر اسی محدود دائرے میں یہ اپنے کرداروں، ماحول اور واقعے کے ذریعے وہ تمام پیچیدہ موضوعات پیش کر سکتا ہے جو انسانی شعور اور لاشعور میں جاری کشمکش کا حصہ ہوتے ہیں۔ اردو افسانہ خاص طور پر اس لیے منفرد ہے کہ اس نے نہ صرف معاشرتی اور سیاسی حقیقتوں کی ترجمانی کی، بلکہ اس نے فرد کی نفسیاتی و روحانی کیفیات کو بھی بے حد باریکی سے قلمبند کیا۔ بیسویں صدی کے وسط میں جب دنیا دو عالمی جنگوں، نوآبادیاتی زوال، تہذیبی ٹکراؤ اور سماجی بے یقینی کے دور سے گزر رہی تھی، تو عالمی ادب میں کئی نئے فکری رجحانات نے جنم لیا۔ ان میں سب سے مؤثر اور بامعنی رجحان وجودیاتی فکر (Existentialism) تھا، جو صرف فلسفے تک محدود نہ رہا بلکہ افسانہ، ناول، تھیٹر اور شاعری جیسے ادبی میدانوں میں بھی گہرائی سے سرایت کر گیا۔ اس نظریے نے فنکاروں کو فرد کی تنہائی، داخلی بحران، شناخت کی پیچیدگی، اخلاقی آزادی، اور کائناتی بے معنویت جیسے سوالات پر غور کرنے پر مجبور کیا۔ وجودیاتی فکر کا یہ اثر اردو افسانہ نگاروں پر بھی مرتب ہوا، اور ان کے افسانوں میں انسان کا انفرادی دکھ، اس کی بے بسی، اور اس کے وجود کا سوال مرکزی حیثیت اختیار کر گیا۔

مرزا(1) اپنے مضمون "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کے تخلیقی نقوش" میں اس تبدیلی کی گہرائی کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "یہ عہد تخلیقی اظہار کا نیا دور ہے، جس میں ادب نے انسانی باطن کی کشمکش کو ایک منفرد زاویہ دیا اور اس کی بے پایاں گہرائیوں کی جستجو کی گئی۔"

وجودیاتی ادب کا بنیادی محور "انسان" ہے — ایسا انسان جو کائنات میں تنہا، غیر یقینی، اور گہرے سوالات میں گھرا ہوا ہے۔ یہ ادب انسان کو کسی اعلیٰ تر یا ماورائی طاقت کے تابع یا غلام کی حیثیت سے پیش کرنے کے بجائے ایک خود مختار، آزاد، مگر ذمہ دار ہستی کے طور پر دکھاتا ہے۔ وجودیاتی ادب کا یہ انسان اپنی زندگی، اپنے فیصلوں، اور اپنے نتائج کا بوجھ خود اٹھاتا ہے۔ وہ زندگی کو کسی طے شدہ مقصد، مذہبی جواز، یا سماجی اصولوں کے تحت نہیں دیکھتا بلکہ وہ خود معنی تخلیق کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہاں آزادی، جو بظاہر خوش کن معلوم ہوتی ہے، دراصل ایک گہرے وجودی بحران کو جنم دیتی ہے۔ کیونکہ جب انسان کو کسی بیرونی اصول کی رہنمائی حاصل نہ ہو، تو اس پر لازم ہوتا ہے کہ وہ اپنے اعمال اور ان کے اخلاقی، جذباتی، اور فکری اثرات کی مکمل ذمہ داری قبول کرے۔ یہ کیفیت بعض اوقات اسے اضطراب، گناہ، اور بے سمتی کے احساس میں مبتلا کر دیتی ہے۔ وجودیاتی ادب کا کردار وہ ہے جو اس کشمکش سے نبرد آزما ہوتا ہے — نہ صرف خارجی دنیا سے، بلکہ اپنی باطنی پیچیدگیوں سے بھی۔ ایسے ادب میں فرد کو ایک ایسی دنیا میں دکھایا جاتا ہے جو نہ صرف غیر منطقی ہے، بلکہ بعض اوقات ظالمانہ بھی محسوس ہوتی ہے۔ وہ دنیا جس میں وہ جیتا ہے، اس کے سوالات کا کوئی معقول جواب نہیں دیتی۔ روایتیں اور اقدار اسے مطمئن کرنے میں ناکام ہو چکی ہیں، اور مذہب یا ریاست جیسے ادارے صرف ضابطے پیش کرتے ہیں، معنی نہیں۔ لہٰذا، انسان خود کو کائنات میں بے بس، تنہا، اور منتشر محسوس کرتا ہے۔ یہی وہ کیفیت ہے جسے Albert Camus نے "absurd" (بے معنویت) کہا ہے — ایک ایسی دنیا جہاں انسان معنی کی تلاش کرتا ہے، مگر دنیا خاموش ہے۔

زیدی اسمتھ(2) لکھتے ہیں:

> "اکیسویں صدی کا ناول محض ایک کہانی سنانے کا ذریعہ نہیں رہا، بلکہ یہ ایک فکری کائنات ہے جہاں مزاحمت محض نعرہ نہیں بلکہ ایک اندرونی مکالمہ بن چکی ہے۔ یہاں سچائیاں ایک نہیں، بے شمار ہیں — بکھری ہوئی، متصادم، اور متوازی — جو قاری کو سوچنے، پرکھنے اور خود اپنی حقیقت دریافت کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔"

وجودیاتی ادب اس انسانی حالت کو محض فلسفیانہ سطح پر بیان نہیں کرتا بلکہ اسے جمالیاتی، فکری، اور علامتی انداز میں قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ افسانے، ناول، شاعری اور تھیٹر میں ایسے کردار ابھرتے ہیں جو بظاہر معمولی انسان ہیں مگر اندرونی سطح پر شدید کشمکش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ وہ اپنے ہونے کا سبب تلاش کرتے ہیں، مگر ہر بار کسی نہ کسی تضاد، المیے یا خاموشی سے ٹکرا جاتے ہیں۔ ادب کا یہ رجحان نہ صرف مغرب میں (مثلاً Kafka، Camus، Sartre کے ہاں) بلکہ اردو ادب میں بھی واضح نظر آتا ہے۔ اردو افسانہ نگاروں نے بھی انسان کے اس وجودی سوال کو اپنا موضوع بنایا — خاص طور پر ایسے وقت میں جب معاشرہ تقسیم، ہجرت، اور تشدد جیسے تجربات سے گزر رہا تھا۔ ایسے میں ادب نے فرد کی تنہائی، شکست، اور داخلی بحران کو زبان دی، اور قاری کو اس کے اپنے ہی سوالات کے روبرو کر دیا۔

ڈیوڈلاج(3) رقمطراز ہے:

> "معاصر افسانہ؛ منتشر خودی کی تہوں، متنوع اور متصادم حقیقتوں، اور ایک عالمگیر تناظر میں وجود کے مبہم و غیر یقینی معانی کو دریافت کرنے کی سنجیدہ کوشش کرتا ہے، جو نہ صرف فرد کی داخلی کشمکش کو اجاگر کرتا ہے بلکہ موجودہ عالمی نظام میں اس کی شناخت، معنویت اور حیثیت پر بھی گہرا سوال اٹھاتا ہے۔"

اردو ادب، خاص طور پر افسانے کی صنف میں، وجودیاتی موضوعات کی جھلک بیسویں صدی کے وسط میں اس وقت نمایاں ہونا شروع ہوئی جب برصغیر ہندو پاک سیاسی، سماجی، اور تہذیبی زلزلوں سے دوچار تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب دو عالمی جنگوں کے اثرات، نو آبادیاتی غلامی کے خلاف تحریکیں، اور تقسیم ہند کے المیے نے فرد کے وجود کو اندر سے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ وہ پرانی اقدار جن پر معاشرے کی بنیاد رکھی گئی تھی، رفتہ رفتہ زوال پذیر ہو رہی تھیں۔ مذہب، خاندان، روایت، اور ریاست جیسے ادارے لوگوں کو وہ تسلی نہیں دے پا رہے تھے جو ایک بدلتی ہوئی، غیر یقینی دنیا میں درکار تھی۔ ایسے میں اردو افسانہ نگاروں کے لیے یہ ممکن نہ رہا کہ وہ صرف خارجی واقعات یا سماجی مسائل کو بیان کریں۔ اب ان کی توجہ انسان کی داخلی کیفیات، نفسیاتی بحران، اور اس کے وجودی سوالات کی طرف مبذول ہونے لگی۔ اردو افسانہ محض ایک بیانیہ صنف نہ رہا، بلکہ ایک فکری تجربہ بن گیا—ایک ایسا تجربہ جس میں قاری کو نہ صرف دنیا کی بے ربطی، ظلم، اور تنہائی کا احساس ہوتا ہے بلکہ وہ خود کو ان سوالات کے بیچ پاتا ہے جن کا کوئی واضح یا آسان جواب موجود نہیں۔ اس دور کے کئی افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات میں فرد کی خودی، اس کی آزادی، اس کی اخلاقی ذمہ داری، اور اس کے وجود کے غیر یقینی معنی کو موضوع بنایا۔ ان کے کردار سماجی یا سیاسی نجات دہندہ نہیں تھے، بلکہ ایسے انسان تھے جو تنہا تھے، منتشر تھے، اور کائنات کے بے رحم تضادات میں گھرے ہوئے تھے۔ ان کا المیہ یہ تھا کہ وہ آزاد بھی تھے، اور اسی آزادی کے بوجھ تلے دبے بھی۔ ان کے پاس انتخاب کا حق تھا، مگر ان انتخابوں کے نتائج کی ذمہ داری بھی انھی کے سر تھی۔ ایسے افسانے صرف سیاسی تقسیم یا معاشی نابرابری کی داستانیں نہ تھے، بلکہ وہ انسانی روح کی گہرائیوں میں جھانکنے کی کوشش تھے۔ ان میں زبان علامتی ہو گئی، پلاٹ غیر روایتی انداز اختیار کرنے لگا، اور کرداروں کے اندرونی خیالات، احساسات اور تضادات کو مرکزیت حاصل ہوئی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب اردو افسانہ عالمی ادبی رجحانات سے ہم آہنگ ہونے لگا، اور وجودیاتی فکر کو اپنے مخصوص تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں سمو کر ایک منفرد اور گہرا ادبی تجربہ تخلیق کیا گیا۔

پروفیسر صغیر افراہیم(4) اپنے مضمون "اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اردو افسانہ" میں ان تبدیلیوں کا تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے اردو افسانے کی جدید جہتوں اور تخلیقی امکانات کی نشاندہی کرتے ہیں:

> "اکیسویں صدی نے اردو ادب میں جو عمیق تحریری تبدیلیاں متعارف کرائی ہیں، وہ محض روایتی موضوعات کی جدید تناظر میں تجزیہ تک محدود نہیں رہیں، بلکہ انہوں نے انسانی تجربات کی تہہ در تہہ پیچیدگیوں اور عہدِ حاضر کے بدلتے ہوئے سماجی، ثقافتی اور فکری حقائق کو ایک نئی بصیرت، گہرائی اور فہم کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ تبدیلیاں نہ صرف ادبی اظہار کے اسلوب کو وسعت دیتی ہیں بلکہ قاری کے فکری شعور کو بھی ایک نئے زاویے سے بیدار کرتی ہیں۔"

وجودیاتی فکر کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ "وجود، ماہیت پر مقدم ہے"—یعنی انسان پہلے وجود میں آتا ہے، اور پھر وہ خود اپنی زندگی کے تجربات، فیصلوں، اور اعمال کے ذریعے اپنی شناخت، فطرت، اور مقصد کو تشکیل دیتا ہے۔ یہ خیال روایتی فلسفے سے یکسر مختلف ہے، جس میں انسان کی فطرت، اخلاقی نظام، اور مقصد کو پہلے سے متعین اور مطلق مانا جاتا ہے، جیسا کہ مذہب، تہذیب یا کسی نظریاتی نظام کے ذریعے بتایا جاتا ہے۔ وجودیاتی فکر میں، انسان کو ایک آزاد ہستی تصور کیا جاتا ہے، جو اپنی آزادی کے ساتھ ساتھ اپنے اعمال کے نتائج کی مکمل ذمہ داری بھی اٹھاتا ہے۔ یہی آزادی اور اس کی ذمہ داری انسان کو ایک گہرے فکری بحران، تنہائی، اور بے معنویت کے احساس سے دوچار کرتی ہے۔ مثلاً، جب کوئی کردار جنگ کے دوران کسی ایسی صورتِ حال سے دوچار ہوتا ہے جہاں اسے اپنے ہی جیسے انسان کو مارنا پڑتا ہے، یا جب ایک مہاجر اپنے ماضی، اپنی جڑوں اور اپنی شناخت سے کٹ کر ایک اجنبی زمین پر از سرِ نو زندگی شروع کرتا ہے، تو وہ کردار محض ایک سماجی یا تاریخی علامت نہیں رہتا، بلکہ ایک وجودی سوال کی مجسم شکل بن جاتا ہے۔ اس کی بے بسی، اس کا اضطراب، اور اس کی خاموشی دراصل ایک اندرونی چیخ ہوتی ہے—ایسی چیخ جو کسی "معنی" کی تلاش میں گونجتی ہے۔ اردو افسانہ، اپنی علامتی زبان، مختصر بیانیہ، اور گہرے نفسیاتی تجزیے کے سبب ایسے وجودی لمحوں کو شدت سے قاری کے سامنے پیش کرتا ہے۔ یہ وہ لمحات ہوتے ہیں جب کردار کا باطن ٹوٹتا ہے، اور وہ سماجی یا مذہبی پردوں سے ہٹ کر اپنے وجود کی گہرائی میں جھانکتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جب افسانہ، محض ادب نہیں رہتا، بلکہ ایک فلسفیانہ مکالمہ بن جاتا ہے—ایک ایسی صدا جو کسی واضح جواب کی امید میں سنائی دیتی ہے، مگر جواب اکثر خاموشی ہوتا ہے۔

کلئیر چیمبرز(5) لکھتے ہیں:

> " اکیسویں صدی میں اردو افسانہ ایک نئے فکری اور اسلوبیاتی سفر پر گامزن دکھائی دیتا ہے، جہاں خود شناسی، تخیلاتی ساخت(metafiction) ، اور حقیقت نگاری جیسے رجحانات کے ساتھ ساتھ بیانیہ کے نئے امکانات کی جانب ایک نمایاں اور شعوری رجحان ابھرتا نظر آتا ہے۔"

اس وجودیاتی فکری تناظر میں دوسرا نہایت اہم اور بنیادی عنصر "شناخت (Identity) " ہے۔ شناخت صرف کسی فرد کے نام، قوم، یا مذہب تک محدود نہیں بلکہ یہ اس کی ذات کے ان تمام پہلوؤں کا مجموعہ ہے جو اسے دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں—جیسے زبان، نسل، جنس، مذہب، ثقافت، معاشرتی رتبہ، اور ذاتی تجربات۔ وجودیاتی فکر کے مطابق، شناخت کوئی جامد، ساکن یا حتمی چیز نہیں بلکہ ایک مسلسل بدلتی ہوئی کیفیت ہے۔ یہ ایک ایسی سیال (fluid) حقیقت ہے جو وقت، حالات، داخلی کشمکش، اور فرد کے انتخاب کے ساتھ ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ روایتی معاشروں میں فرد کی شناخت اکثر موروثی یا سماجی طور پر طے شدہ تصور کی جاتی ہے، جیسے کوئی "مسلمان"، "ہندو"، "عورت"، "غریب"، "سپاہی"، یا "محبِ وطن" ہونا۔ مگر وجودیاتی ادب ان جامد شناختوں کو چیلنج کرتا ہے۔ یہاں شناخت کسی خارجی لیبل یا ادارہ جاتی تعریف کی بجائے ایک داخلی تجربہ بن جاتی ہے—ایسا تجربہ جو فرد کو مسلسل سوال

کرنے پر مجبور کرتا ہے: "کیا میں وہی ہوں جو مجھے کہا جا رہا ہے؟ یا میں کچھ اور ہوں؟"۔ یہ سوال فرد کے اندر ایک گہری فکری اور جذباتی کشمکش پیدا کرتا ہے۔ افسانوی کردار جب ان سوالات کے ساتھ جیتے ہیں تو وہ نہ صرف اپنے ارد گرد کی دنیا سے بلکہ خود اپنی ذات سے بھی اجنبیت محسوس کرنے لگتے ہیں۔ وہ آئینے میں خود کو دیکھتے ہیں لیکن پہچان نہیں پاتے؛ وہ اپنے ماضی کو یاد کرتے ہیں، مگر وہ ماضی اب اجنبی لگتا ہے؛ وہ جن رشتوں سے جڑے ہوتے ہیں، ان میں بھی ایک خلا محسوس کرتے ہیں۔ یہ اجنبیت — خود سے، ماضی سے، سماج سے — وجودیاتی ادب میں شناختی بحران کی علامت ہے۔ اردو افسانے میں یہ کیفیت کئی زاویوں سے ظاہر ہوتی ہے۔ تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھے گئے افسانوں میں کردار اپنے وطن، مذہب، اور برادری کے حوالے سے شناختی بحران کا شکار دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے لیے یہ سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے کہ اب وہ کس سرزمین کے شہری ہیں، کس زبان کے وارث ہیں، اور کس نظریے کے پیروکار ہیں۔ مہاجر، سپاہی، عورت، اقلیت — یہ تمام کردار جب اپنے لیے کوئی شناخت تلاش کرنے نکلتے ہیں، تو اکثر ایک خالی پن، تضاد، اور انکار کے تجربے سے گزرتے ہیں۔ یہی کیفیت ان کے فیصلوں، اعمال اور تعلقات کو متاثر کرتی ہے۔ وہ بعض اوقات ایسے فیصلے کرتے ہیں جو ظاہری طور پر "غلط" نظر آتے ہیں، مگر دراصل وہ اس شناختی بحران کی پیداوار ہوتے ہیں جس کا وہ شکار ہوتے ہیں۔ یہی داخلی کشمکش اور سوالات افسانے کو محض ایک بیانیہ سے بڑھا کر ایک فکری اور فلسفیاتی تجربہ بنا دیتے ہیں۔

اس تناظر میں انسانی ہستی جامد نہیں بلکہ ایک مسلسل متحرک، ارتقائی اور معنویت کے متلاشی وجود کے طور پر نمایاں ہوتی ہے، نطشے (6) کے مطابق:

> "اپنے باطن کی شناخت حاصل کرو، اپنی انفرادیت کی تشکیل خود کرو، اور وہ بنو جو تمہاری فطری ماہیت سے ہم آہنگ ہو۔ انسان کو چاہیے کہ وہ اپنے وجود کا مجسمہ ساز بنے اور اپنی ذات کو ایک تخلیقی شعور کے تحت سنوارے۔"

وجودیاتی فکر کے تناظر میں تیسرا اور نہایت اہم عنصر "بے معنویت (Absurdity) " ہے، جو فرد اور کائنات کے درمیان پائے جانے والے بنیادی تضاد کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ تصور اس وقت جنم لیتا ہے جب انسان کسی حتمی، مطلق یا مربوط معنی کی تلاش میں ہو، مگر دنیا کی ساخت، تجربات اور رویے اسے اس تلاش میں ناکام کر دیتے ہیں۔ وجودیاتی مفکرین، خصوصاً البرٹ کامو، کے مطابق بے معنویت اس لمحے پیدا ہوتی ہے جب انسانی شعور، کائناتی خاموشی اور عدم مطابقت کا سامنا کرتا ہے۔ جب انسان اپنی زندگی کے تجربات سے کوئی منطقی یا اخلاقی جواز اخذ کرنے میں ناکام رہتا ہے، تو وہ ایک فکری بحران سے دوچار ہوتا ہے جو اسے بے معنویت کے دائرے میں داخل کر دیتا ہے۔ اردو افسانے میں اس تصور کی جھلک اس وقت نمایاں طور پر دکھائی دیتی ہے جب کوئی کردار ایسی صورتِ حال سے گزرتا ہے جو ظاہری طور پر ناقابلِ فہم، غیر متوقع یا غیر منصفانہ ہو — مثلاً جنگ، مہاجرت، تنہائی، موت یا دھوکہ۔ ان حالات میں کردار اپنی ذات، سماج اور خدا سے تعلق کے روایتی معانی سے دست بردار ہو جاتا ہے، یا ان پر سوال اٹھاتا ہے۔ افسانوی بیانیہ جب ایسے کردار کو پیش کرتا ہے جو اپنی زندگی کے کسی المیے کو سمجھنے، قبول کرنے یا معنویت دینے سے قاصر ہو، تو وہ بے معنویت کے فلسفے کو مجسم کر دیتا ہے۔ یہ کیفیت نہ صرف کردار کے داخلی کرب کو نمایاں کرتی ہے بلکہ قاری کو بھی اس تجربے میں شریک کر لیتی ہے۔ کردار اکثر ایسی گفتگو یا افعال کا اظہار کرتا ہے جو روایتی اقدار کے تناظر میں غیر متوقع یا غیر معقول معلوم ہوتے ہیں، تاہم وہ دراصل ایک گہرے وجودی بحران کا اظہار ہوتے ہیں۔ یہی داخلی اضطراب اور خارجی بے ترتیبی افسانے کو محض بیانیہ نہیں رہنے دیتی، بلکہ اسے ایک فکری اور فلسفیانہ تجربہ بنا دیتی ہے۔ مختصر افسانہ، اپنی علامتی زبان، مختصر ساخت اور نفسیاتی گہرائی کے باعث، بے معنویت جیسے نازک اور پیچیدہ فلسفیانہ تصور کو مؤثر انداز میں پیش کرنے کی بھرپور صلاحیت رکھتا ہے۔ افسانہ قاری کو ایسے لمحے میں لا کھڑا کرتا ہے جہاں روایتی اخلاقی یا معاشرتی اصول اپنی معنویت کھو دیتے ہیں، اور انسانی وجود محض ایک خالی، مبہم اور پُر سوال دائرے میں گردش کرتا دکھائی دیتا ہے۔ نتیجتاً، جب اردو افسانہ اس درجے پر پہنچتا ہے، تو وہ صرف ایک تخلیقی اظہار نہیں رہتا بلکہ ایک فکری جدوجہد اور انسانی شعور کی عکاسی بن جاتا ہے۔ اس طرح افسانہ فرد کے وجود، اس کی شناخت، اور اس کی معنویت کی تلاش کو ایک ہمہ گیر فکری تجربہ میں تبدیل کر دیتا ہے، جس میں قاری نہ صرف مشاہدہ کرتا ہے بلکہ خود اس فکری سفر میں شامل ہو جاتا ہے۔ ساترے (7) لکھتا ہے:

> "وجودیت کا اولین اصول یہ ہے کہ انسان کا وجود اس کی فطری تعریف سے مقدم ہے؛ وہ پہلے دنیا میں آتا ہے، حالات سے نبرد آزما ہوتا ہے، اور پھر اپنی ذات، مقصد اور اقدار کی تخلیق خود کرتا ہے۔ وہی کچھ بنتا ہے جو وہ اپنے شعوری انتخاب سے اپنے لیے چنتا ہے۔"

ادب میں نظریات کا اطلاق اس وقت زیادہ مؤثر ہوتا ہے جب وہ کسی مخصوص تخلیق کے داخلی نظام اور معنوی سطح سے ہم آہنگ ہوں۔ اردو افسانہ چونکہ فرد کی داخلی کیفیت، ذہنی پیچیدگی، اور خارجی تضادات کو مختصر مگر گہرے انداز میں پیش کرتا ہے، اس لیے وجودیاتی فکر جیسے دقیق فلسفیانہ نظریے کو اس صنف کے ذریعے بخوبی برتا جا سکتا ہے۔ اردو افسانے کی تاریخ میں سعادت حسن منٹو ایک ایسا نمایاں نام ہے جس نے فرد کی داخلی کشمکش، سماجی جبر، اور انسان کے وجودی سوالات کو نہایت جرأت اور فکری گہرائی سے بیان کیا۔ منٹو کا فن محض سیاسی یا سماجی بیانیہ نہیں، بلکہ وہ انسانی روح کی تہہ در تہہ پرتوں میں اترنے کی ایک کوشش ہے۔ ان کے افسانوں میں نہ صرف انسان کی شناخت کا بحران جھلکتا ہے، بلکہ وہ اکثر ایک ایسی دنیا کے خدوخال پیش کرتے ہیں جو قاری کو معنویت کی شکست، اخلاقی ابہام، اور وجودی تنہائی سے روشناس کرواتے ہیں۔ ان ہی فکری پس منظروں کو مدنظر رکھتے ہوئے، منٹو کا معروف افسانہ "آخری سلیوٹ" ایک موزوں اور مؤثر مثال ہے، جس میں وجود، شناخت، اور بے معنویت جیسے تصورات نہایت فنکارانہ انداز میں پیوست ہیں۔ اب ہم اس افسانے کا مطالعہ وجودیاتی تناظر میں کریں گے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ منٹو فرد، سماج، اور انسانی شعور کی پیچیدگی کو کس حد تک فلسفیانہ گہرائی کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔

(2)

منٹو کا افسانہ "آخری سلیوٹ" برصغیر کی تقسیم کے بعد کی صورتحال کو نہایت سادگی مگر گہرائی سے بیان کرنے والا ایک مختصر افسانہ ہے جو محدود الفاظ میں ایک وسیع انسانی، جذباتی اور فکری منظر نامہ پیش کرتا ہے۔ یہ افسانہ اس وقت کے سیاسی و سماجی پس منظر میں لکھا گیا جب برصغیر کے لوگ سرحد کے دونوں جانب ایک نئے وجود، نئی شناخت اور نئی حقیقت سے دوچار تھے۔ وقار عظیم(8) کے مطابق:

> "منٹو کو اس کی حقیقت نگاری، نفسیاتی گہرائی، جرات مندانہ صداقت اور سماجی و مذہبی اداروں پر طنز کے باعث سراہا گیا، جب کہ اسی بے باکی پر اسے تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا۔ اس کے بارے میں رویوں میں اگرچہ توازن موجود ہے، تاہم افراط و تفریط زیادہ نمایاں ہے۔"

"آخری سلیوٹ" میں یہی سچ جھلکتا ہے جہاں نہ صرف ایک دوست دوسرے پر گولی چلاتا ہے، بلکہ اُسے ایک آخری خراجِ عقیدت بھی پیش کرتا ہے — وہ سلیوٹ جو صرف رسمی فوجی انداز نہیں بلکہ ایک باطنی اضطراب اور جذباتی پیچیدگی کی علامت ہے۔ کہانی کا مرکزی واقعہ دو سابقہ فوجی دوستوں رام سنگھ اور نواب کے درمیان ایک جنگی تصادم پر مبنی ہے۔ تقسیم سے پہلے وہ ایک ہی فوج کا حصہ تھے — کھاتے ساتھ تھے، سوتے ساتھ تھے، اور اپنے جذبات بھی بانٹتے تھے۔ مگر تقسیم نے صرف زمینوں کو نہیں بانٹا، "دلوں کے نقشے بھی بدل دیے"۔ اب دونوں اپنے اپنے ملک کی فوجوں کا حصہ بن چکے ہیں، اور اتفاقاً ایک روز جنگ کے میدان میں ان کا سامنا ہو جاتا ہے۔ نواب، جو پاکستانی فوج کا سپاہی ہے، رام سنگھ کو پہچان کر گولی چلاتا ہے، اور پھر ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے سلیوٹ کرتا ہے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں ماضی، حال، جذبات، شناخت اور فرض سب ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے ہیں۔ یہ سلیوٹ منٹو کے تخلیقی شعور کی بلند ترین سطح ہے۔ وہ جانتا تھا کہ انسان صرف ایک "سپاہی" نہیں، بلکہ ایک "احساس رکھنے والا وجود" بھی ہے۔ اس سلیوٹ میں محبت ہے، یاد ہے، اور شاید ندامت بھی۔ وارث علوی(9) رقمطراز ہیں:

> "منٹو اگرچہ نقاد نہیں تھا، مگر اس نے ادب اور اس کے مقصد کے بارے میں گہری بصیرت فراہم کی۔ وہ نہ صرف ہنگاموں کا مشاہدہ کرتا بلکہ ان پر سوچتا بھی تھا۔ اس کے تنقیدی شعور کو سمجھے بغیر اس کے فن اور شخصیت کی مکمل تفہیم ممکن نہیں۔"

آخری سلیوٹ" بھی ایسے ہی ایک ناقابلِ برداشت دور کی سچائی ہے، جہاں انسانیت، شناخت اور دوستی جیسے لطیف احساسات کو سرحدوں، نظریاتی تقسیم اور جنگوں کے ملبے تلے دفن کیا جا رہا تھا۔ افسانے کا یہ لمحہ صرف ایک گولی یا ایک سلیوٹ کا لمحہ نہیں، بلکہ وجودیاتی بحران کی مکمل تصویر ہے۔ یہاں رام سنگھ کی شناخت بطور "دشمن" اور نواب کی شناخت بطور "دوست" بیک وقت موجود ہیں۔ یہ وہ لمحہ ہے جہاں منٹو(10) بتاتے ہیں:

> "صوبیدار رب نواز سوچتا تھا کہ یہ سب خواب تو نہیں! پچھلی بڑی جنگ کا اعلان بھرتی، قد اور چھاتیوں کی پیمائش، پی ٹی پھر چاندماری اور پھر محاذ، ادھر سے ادھر ادھر سے اُدھر، آخر جنگ کا خاتمہ پھر ایک دم پاکستان کا قیام اور ساتھ ہی کشمیر کی لڑائی۔ اوپر تلے کتنی چیزیں۔ رب نواز سوچتا تھا کہ کرنے والے نے یہ سب کچھ سوچ سمجھ کر کیا ہے تاکہ دوسرے بوکھلا جائیں اور سمجھ نہ سکیں۔ ورنہ یہ بھی کوئی بات تھی کہ اتنی جلدی اتنے بڑے انقلاب برپا ہو جائیں۔"

منٹو کے افسانے "آخری سلیوٹ" میں سب سے نمایاں وجودیاتی پہلو انسانی وجود کی تنہائی، آزادی، اور فیصلہ سازی کی پیچیدگی ہے۔ وجودیاتی فکر کے مطابق، انسان پہلے "وجود" میں آتا ہے اور پھر "ماہیت" تخلیق کرتا ہے — یعنی فرد اپنے افعال، فیصلوں اور تجربات کے ذریعے اپنی شناخت اور مقصد خود بناتا ہے، کوئی بیرونی طاقت اسے متعین نہیں کرتی۔ جیسا سارتر(11) لکھتا ہے:

> "انسان آزادی کے جرم کا شکار ہے؛ کیونکہ ایک بار دنیا میں پھینکا گیا، وہ ہر اس کام کا ذمہ دار ٹھہرتا ہے جو اس نے انجام دیا ہو۔"

اس افسانے میں نواب اور رام سنگھ دو ایسے کردار ہیں جو سیاسی اور جنگی سٹرکچر کا حصہ ضرور ہیں، لیکن ان کا اندرونی وجود، ان کے انفرادی فیصلے، اور ان کی باطنی کشمکش انہیں محض فوجی کردار بننے سے روکتی ہے۔ افسانے کا وہ لمحہ جب نواب، رام سنگھ پر گولی چلا کر "آخری سلیوٹ" کرتا ہے، وجودیاتی بحران کی ایک مکمل تصویر ہے۔ وہ عمل نہ صرف ایک ظاہری واقعہ ہے، بلکہ نواب کے باطن میں جاری جنگ کا اظہاریہ بھی ہے۔ یہاں ایک فرد اپنی جنگی شناخت کے مطابق "دشمن" کو مارنے پر مجبور ہے، لیکن اس کا ذاتی تجربہ، اس کی یادداشتیں، اور اس کا اخلاقی شعور اسے محض قاتل نہیں رہنے دیتے۔ وہ گولی چلاتا ہے — جو شاید اس کے "سماجی وجود" کا تقاضا ہے — مگر فوراً سلیوٹ کرتا ہے — جو اس کے "انفرادی وجود" کی گواہی ہے۔ منٹو(12) لکھتے ہیں:

"ایک مرتبہ صوبیدار رب نواز اپنی پلاٹون کے جوانوں کے ساتھ شب خون مارنے کے لئے تیار ہو رہا تھا کہ دور نیچے، ایک کھائی سے گالیوں کا شور اٹھا۔ پہلے تو وہ گھبرا گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ بہت سے بھوت مل کر ناچ رہے ہیں اور زور زور کے قہقہے لگا رہے ہیں۔ وہ بڑبڑایا۔ خنزیر کی دم، یہ کیا ہو رہا ہے۔"

یہی ننگی حقیقت نواب کے عمل میں جھلکتی ہے، جہاں وہ اپنے فوجی لبادے سے باہر نکل کر ایک انسان بن جاتا ہے—وہ انسان جو فیصلہ کرتا ہے، پچھتاتا ہے، اور یاد کرتا ہے۔ وجودیاتی فکر میں آزادی ایک بوجھ بھی ہے، کیونکہ فرد کو خود فیصلہ کرنا ہوتا ہے اور وہ اپنے فیصلوں کا مکمل ذمہ دار ہوتا ہے۔ نواب کا یہ عمل—دوست کو مارنا اور سلیوٹ کرنا—اسی آزاد فیصلے کی پیچیدگی ہے۔ یہ آزادی اسے مذہب، ریاست یا ادارہ نہیں دیتا، بلکہ اس کے باطن کی آواز ہے۔ لیکن یہی آزادی اسے اندر سے توڑ دیتی ہے، کیونکہ اب وہ اپنی ہی ذات کے سامنے جواب دہ ہے۔ وکٹر فرینک(12) لکھتے ہیں:

"انسان محض موجود نہیں رہتا بلکہ ہمیشہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی موجودگی کیسی ہوگی، اور اگلے لمحے میں وہ کیا بن جائے گا۔ اسی طرح ہر انسان کے پاس اس بات کی آزادی ہوتی ہے کہ وہ کسی بھی لمحے خود کو تبدیل کر سکے۔"

"آخری سلیوٹ" میں یہی جرم فرد کے اندر گونجتا ہے—ایک ایسا لمحہ جہاں نواب اپنی تمام شناختوں، وفاداریوں، اور فکری پابندیوں سے ماورا ہو کر محض ایک وجود بن جاتا ہے—ایک ایسا وجود جو دوست اور دشمن کے فرق میں نہیں، بلکہ انسانی رشتے کی بے بسی میں الجھا ہوا ہے۔ منٹو کے افسانے "آخری سلیوٹ" میں شناخت کا بحران ایک گہرے وجودیاتی مسئلے کے طور پر ابھرتا ہے۔ رام سنگھ اور نواب، جو کبھی ایک ہی وردی پہنے، ایک ہی پرچم کے نیچے لڑنے والے ساتھی تھے، اب ایک ایسی جنگ کا حصہ ہیں جس نے ان کی پرانی شناختوں کو مسخ کر دیا ہے۔ اب رام سنگھ "ہندو اور بھارتی" ہے، اور نواب "مسلمان اور پاکستانی"—مگر یہ نئی شناختیں محض رسمی اور سیاسی ہیں؛ ان کے باطن میں دوستی، ماضی، اور ذاتی رشتے اب بھی زندہ ہیں۔ شناخت کا یہ ٹکراؤ وجودیاتی فکر کے اس پہلو سے میل کھاتا ہے جہاں انسان کی شناخت کوئی جامد چیز نہیں، بلکہ ایک سیال (fluid) حقیقت ہے جو حالات، فیصلوں، اور تجربات کے ساتھ بدلتی رہتی ہے۔ جب نواب اپنے پرانے دوست پر گولی چلاتا ہے، تو وہ نہ صرف ایک انسان کو مار رہا ہوتا ہے، بلکہ اپنے ہی ماضی، اپنے آپ، اور اپنی پرانی شناخت کو بھی زخمی کر رہا ہوتا ہے۔ اور یہی پہچان کا انتشار اس کے اس "آخری سلیوٹ" میں جھلکتا ہے—ایک ایسا سلیوٹ جو ریاستی وفاداری اور ذاتی محبت کے درمیان پھنسی ہوئی شناخت کا علامتی اظہار ہے۔

منٹو(13) کے الفاظ میں:

" رب نواز کو وہاں کی پہاڑیوں میں ایک عجیب بات نظر آئی تھی۔ چڑھائی کی طرف کوئی پہاڑی درختوں اور بوٹوں سے لدی پھندی ہوئی تھی اور اترائی کی طرف گنجی، کشمیری بہتو کی طرح کسی کی چڑھائی کا حصہ گنجا ہوتا تھا اور اترائی کی طرف درخت ہی درخت ہوتے تھے۔ چیڑ کے لیے تناور درخت جن کے بٹے ہوئے دھاگے جیسے پتوں پر فوجی بوٹ پھسل پھسل جاتے تھے۔"

رب نواب کے دل میں بھی یہی آئینہ موجود ہے، جو اُسے رام سنگھ کی شکل میں خود اپنا ہی ایک عکس دکھاتا ہے—ایک ایسا عکس جو اب "دشمن" ہے، مگر کبھی "دوست" تھا، اور شاید اب بھی ہے۔ افسانے میں شناخت صرف مذہب یا قومیت کی بنیاد پر قائم نہیں؛ یہ ایک داخلی تجربہ ہے، ایک مسلسل بدلنے والی حالت، جس پر بیرونی حالات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ منٹو یہاں یہ دکھانے میں کامیاب ہوتے ہیں کہ ایک فوجی کی شناخت صرف وردی اور پرچم تک محدود نہیں، بلکہ اس کے اندر کے انسان کی پرانی وابستگیاں اور تعلقات بھی اس کی شناخت کا حصہ ہیں۔ وجودیاتی ادب میں بے معنویت اس وقت سامنے آتی ہے جب انسان کائنات یا معاشرے سے وہ "معنی" یا "مقصد" حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے، جو اسے نہیں ملتا۔ یہ احساس کہ دنیا میں کوئی حتمی، واضح یا عقلی ترتیب موجود نہیں، فرد کو ایک داخلی خلا سے دوچار کر دیتا ہے۔ منٹو کے افسانے "آخری سلیوٹ" میں یہ بے معنویت نہایت واضح انداز میں ابھرتی ہے، جہاں دوستی، جنگ، وفاداری، دشمنی، اور موت—سب ایک ہی وقت میں اپنا مطلب کھو بیٹھتے ہیں۔ افسانے کا وہ لمحہ—جب نواب، اپنے پرانے دوست رام سنگھ پر گولی چلا کر اُسے سلیوٹ کرتا ہے—اسی بے معنویت کا اظہار یہ ہے۔ یہ سلیوٹ بظاہر فوجی روایت ہے، مگر باطن میں یہ ایک المیے کی بے زبان چیخ ہے۔ ایک ایسا لمحہ جہاں سب کچھ بے ربط محسوس ہوتا ہے۔ کیا یہ دوست دشمن ہے؟ کیا یہ گولی فرض ہے یا غداری؟ کیا یہ سلیوٹ احترام ہے یا پچھتاوا؟ ان سوالات کا کوئی معقول یا حتمی جواب موجود نہیں—اور یہی بے معنویت کا مرکز ہے۔ یہ بے معنویت صرف نواب تک محدود نہیں، بلکہ افسانے کی فضا، ماحول، اور بیانیہ میں بھی سرایت کر چکی ہے۔ کہانی کسی بڑی جنگی حکمتِ عملی یا قومی عظمت کا بیان نہیں دیتی، بلکہ ایک لمحہ دکھاتی ہے—ایک ایسا لمحہ جس میں فرد، ریاست، جنگ اور یادیں سب ایک الجھے ہوئے وجود میں مدغم ہو جاتے ہیں۔ جنگ یہاں کوئی "مقدس" عمل نہیں، بلکہ ایک ایسی "لغویت" (absurdity) ہے جو فرد کی شناخت، وجود اور احساس کو مٹا دیتی ہے۔ نواب کی گولی اور اس کا سلیوٹ—دونوں ہی عمل—ایک ایسی دنیا کے آئینہ دار ہیں جو کسی واضح اصول، اخلاقی ترتیب یا جذباتی منطق سے عاری ہے۔ یہی بے معنویت قارئین کو جھنجھوڑتی ہے۔

مجموعی طور پر منٹو کا افسانہ "آخری سلیوٹ" محض تقسیمِ ہند کے پس منظر میں لکھا گیا ایک تاریخی افسانہ نہیں، بلکہ یہ ایک وجودیاتی تجربہ ہے، جو انسانی شعور، باطنی الجھنوں، اور معنی کے بحران کو نہایت فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے۔ منٹو ان چند افسانہ نگاروں میں سے ہیں جنہوں نے ادب کو صرف سماجی تنقید کا آلہ نہیں بنایا، بلکہ انسان کے وجود کے بنیادی سوالات کو

بھی زیرِ بحث لایا۔ افسانے کا اختتام کسی ظاہری نتیجے پر نہیں ہوتا۔ قاری کو چھوڑ دیا جاتا ہے—اسی طرح جیسے نواب اپنے ضمیر کے ساتھ چھوڑا جاتا ہے—ایک خلا، ایک سکوت، اور ایک اندرونی بے ترتیبی کے ساتھ۔ اور یہی منٹو کا کمال ہے: وہ نہ معنی دیتا ہے، نہ جواب—صرف ایک آئینہ دکھاتا ہے، جو قاری کو اپنی ہی بے معنویت کا سامنا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ آخری سلیوٹ میں کہانی ختم ہو جاتی ہے، مگر معنی کا تعطل باقی رہتا ہے۔

حوالہ جات وحواشی:

(1) مرزا، مبین (2018ء)، "اکیسویں صدی میں اردو افسانے کے تخلیقی نقوش"؛ لاہور، پبلشر بزمِ اردو لائبریری، ص 1۔
(2) اسمتھ، زیدی (2005ء)، "On Beauty"، لندن: پینگوئن بکس، ص 112۔
(3) لاج، ڈیوڈ (2002ء)، "Consciousness and the Novel"، کیمبرج، ایم اے: ہارورڈ یونیورسٹی پریس، ص 87۔
(4) افراہیم، پروفیسر صغیر (2011ء)، "اکیسویں صدی کی پہلی دہائی کا اردو افسانہ"؛ دہلی، پبلشر چوتھی دنیا، ص 21۔
(5) چیمبرز، کلیئر (2007ء)، " British Muslim Fictions: Interviews with Contemporary Writers "، لندن: پالگریو میکملن، ص 145۔
(6) نطشے، فریڈرک (2006ء)، " Thus Spoke Zarathustra" آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ص 312۔
(7) سارترے، جے پی (2007ء)، " Existentialism is a humanism"، ییل یونیورسٹی پریس، ص 17۔
(8) عظیم، سید وقار (1986ء)، "منٹو کا فن"، نیو دہلی: اعجاز پبلشنگ ہاؤس، ص 1۔
(9) علوی، وارث (1997ء)، "منٹو: ایک مطالعہ"، نیو دہلی: وجے پبلشرز، ص 9۔
(10) منٹو، سعادت حسن (1986ء)، "آخری سلیوٹ"، مشمولہ: یزید، دہلی: ساقی بک ڈپو، ص 31۔
(11) سارترے، جے پی (2007ء)، " Existentialism is a humanism"، ییل یونیورسٹی پریس، ص 77۔
(12) فرینک، ای وکٹر (2006ء)، " Man's Search for Meaning"، بیکن پریس، ص 113۔
(13) منٹو، سعادت حسن (1986ء)، "آخری سلیوٹ"، مشمولہ: یزید، دہلی: ساقی بک ڈپو، ص 31۔

IEER
Institute for Excellence in Education & Research